ڈاکٹر وسیم صدیقی
10/8th Road North
Ahmadi 61008, KUWAIT

چنے والا

چنا۔ چینا۔ چانا۔ چنے کی جب کئی قسموں کی آوازیں میرے کانوں میں قرأت کے انداز میں گونجیں تو میں چلتی گاڑی میں غنودگی کے عالم سے جاگ اُٹھا اور چونک کر اُس نوعمر لڑکے کو دیکھنے لگا جو ایک چھوٹے سے جھابے میں چنے لیے ہوئے چنے کی مختلف لہجوں میں گردان کر رہا تھا اور ٹرین کے زیادہ تر مسافر جس میں اکثر و بیشتر ڈیلی پسنجر تھے، بڑے زور شور سے چنے خرید رہے تھے۔ وہ لڑکا چنے بیچنے کے ساتھ ساتھ چنے کی شان میں قصیدے بھی پڑھتا جا رہا تھا اور اُس کی آواز چلتی ہوئی ٹرین کے شور شرابے پر بھی بھاری تھی۔

میں بھی اپنے پاس بیٹھے ہوئے مسافروں کی گفتگو میں شامل ہوگیا جو وہ لوگ چنے کی شان میں کر رہے تھے۔ مثلاً کتنا کرارہ ہے، چٹپٹا ہے ہے، سوندھا ہے، مزیدار ہے وغیرہ وغیرہ۔ پورا کمپارٹمنٹ چنے کی خوشبو سے بس چکا تھا۔ میں نے کہا چنا واقعی بہت سوندھا ہے۔ اِس پر بغل میں بیٹھے لالہ نما مسافر نے کہا: ''اجی آپ نے تو چنا کھایا ہی نہیں، کیسے کہہ رہے کہ چنا بڑا سوندھا ہے''۔ میں نے کہا: ''وہ تو اُس کی خوشبو سے ہی پتہ چل رہا ہے۔'' لالہ جی بولے: ''خوشبو وشبو کچھ نہیں لو تھوڑا سا ٹسٹ کرو۔'' اور اُنھیں ہاتھوں سے جن سے وہ کھجلا رہے تھے، تھوڑا سا چنا میری طرف بڑھایا۔ اور مجھے بس قے ہوتے ہوتے رہ گئی۔ میں نے بڑی بداخلاقی سے چنا پکڑنے سے انکار کر دیا۔ اب بھی کبھی میں سوچتا ہوں تو اپنی اس بے مروتی پر کافی افسوس ہوتا ہے۔ کوئی عذر کر کے چنا لینے سے انکار کر دیتا۔ بہر حال جب پورے ڈبے میں ایک آدمی بھی چنے کی بُرائی کرنے والا نظر نہیں آیا تو میں سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ چنا واقعی اچھا ہوگا ورنہ لوگ عام طور سے کسی چیز کی تعریف کرنے میں اتنا سخی نہیں ہوتے اور بُرائیاں کرنی ہوں تو ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے ہیں۔ میں نے بھی آخر کار اُس سے چنا خرید ہی لیا۔ یہ تھی میری اُس چنے والے سے پہلی ملاقات۔

ایک ٹریننگ کے سلسلے میں مجھے روزانہ الہ آباد سے مرزا پور تک اپ ڈاؤن کرنا پڑتا تھا۔ ٹرین میں ڈیلی پسنجرس کے ہنگامے رہتے تھے۔ لگتا تھا کہ اُن کے تفریح کے مشاغل صرف ٹرین ہی میں ہوتے

ہیں۔شور ہنگامے کے ساتھ ڈبے میں داخل ہوتے ہیں۔ڈبہ کتنا ہی بھرا کیوں نہ ہو، ہر آدمی لڑ جھگڑ کے اپنی جگہ بنا ہی لیتا تھا اور اِس طرح بیٹھتا کہ دو دو یا چار چار کی جوڑی بن جائے تا کہ تاش کی پھڑ جم جائے۔ جو تاش نہیں کھیل رہے ہوتے اُن میں سے کوئی دیش کی حالت پر رننگ کمنٹری شروع کر دیتا یا پھر کوئی ڈینگیں مارتا کہ اُس نے دفتر میں اپنے باس کو کیسے ہڑکایا اور کبھی کوئی شخص بے سُر تال کے بے ہنگم سا گانا گانے لگتا اور اسی شور شرابے کے بیچ چنے والا بھی اپنی انوکھی آواز سے مسافروں کو چونکا دیتا۔

میں ایک مہینے سے روزانہ سفر کر رہا ہوں۔اُس چنے والے سے میری اچھی خاصی دوستی ہو چکی ہے کیونکہ میں بھی باقاعدگی سے اُس سے چنا خریدنے لگا ہوں۔اِس ایک مہینے کے سفر میں محسوس ہو رہا ہے کہ میں بھی اچھا خاصا شاطر ڈیلی پسنجر ہو کر رہ گیا ہوں۔میرے اندر جو شائستگی تھی وہ دھیرے دھیرے ختم ہوتی جا رہی ہے۔ پہلے کمپارٹمنٹ میں اگر جگہ نہیں ہوتی تھی تو کھڑا رہتا تھا اب گھس پیٹھ کر کے جگہ بنا لیتا ہوں۔اور اگر کوئی مسافر سیٹ پر کھسکنے یا جگہ دینے میں آنا کانی کرتا تو اُس کو دو چار دھکے بھی لگا دیتا ہوں۔ کئی نئی طرح کے الفاظ سیکھ چکا ہوں۔اُن کا استعمال کبھی بے خیالی میں کر دیتا ہوں تو لوگ ششدر رہ جاتے ہیں۔ ہاں تو بات اُس چنے والے کی ہو رہی تھی۔اس ایک مہینے کے دوران میری اُس سے کافی دوستی ہو چکی تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ چنے کی شان میں جو وہ شاعری کرتا ہے، اُس نے کہاں سے سیکھی۔اُس نے بتایا کہ یہ سب شاعری اُس کے باپ نے ایجاد کی ہے جو اس سے پہلے چنا ہی بیچنے کا کام کرتے تھے۔اور پھر یہ جان کر مجھے افسوس ہوا کہ اُس کا باپ تیز چلتی ٹرین پر چڑھتے ہوئے پھسل گیا اور ٹرین کے نیچے آ کر کٹ گیا۔ پھر سارے گھر کی ذمے اس پر آ گئی۔اُس نے بتایا جب اُس کے باپ کا دیہانت ہوا تو وہ پانچویں درجے میں پڑھتا تھا اور اُس کا باپ اگر نہ مرا ہوتا تو وہ آج دسویں جماعت میں ہوتا اور آگے پڑھتا رہتا۔

گاڑی کی رفتار اب کچھ دھیمی ہو گئی تھی۔تھوڑی ہی دیر میں وندھیا چل آنے والا تھا۔میں نے سوچا کہ تھوڑی دیر میں چنے والا ڈبے میں داخل ہوگا۔دوسرے ڈبوں سے چنے بیچتا ہوا وہ اکثر وندھیا چل کے اسٹیشن پر ہمارے ڈبے میں داخل ہوتا تھا اور اپنی صدا لگا کر ڈبے میں ہلچل پیدا کر دیتا تھا۔یکا یک ٹرین آہستہ ہو کر رُک گئی۔آس پاس کوئی گاؤں تھا۔شاید کسی نے ٹرین کی زنجیر کھینچ دی تھی جبھی غالباً بغل کے ڈبے سے کافی شور اور چیخ پکار کی آوازیں آنے لگیں۔اُس کمپارٹمنٹ سے چار پانچ آدمی ہا کی اور ڈنڈوں سے لیس گاؤں کی طرف بھاگتے چلے گئے۔ نیچے کھڑے ریلوے پولس کے جوان جو شور سُن کر وہاں آ گئے تھے اُن کی ہمت نہ ہوئی کہ اُن بھاگتے ہوئے آدمیوں کو روک سکیں۔اب لوگ اپنے اپنے ڈبوں سے اُتر اُتر کر بغل والے ڈبے کی طرف جا رہے تھے۔ میں بھی وہاں پہنچا تو دیکھا کہ وہی چنے والا خون میں لت پت فرش پر پڑا ہوا تھا۔ پتہ چلا کہ اُن چار پانچ آدمیوں نے چنے والے کی بے تحاشہ پٹائی کی تھی

اور زنجیر کھینچ کر گاڑی روکی اور بھاگ نکلے۔ کسی بھی مسافر نے چنے والے کو بچانے کی ہمت نہیں دکھائی۔ ٹرین میں جتنی مرہم پٹی ہو سکتی تھی کی گئی۔ پھر گاڑی چل پڑی۔ وندھیا چل اسٹیشن آ گیا۔ دو تین مسافروں نے جو غالباً چنے والے کے گاؤں کے تھے اُس کو ٹرین سے اُتار لیا تا کہ کسی قریبی ہسپتال میں اُسے بھرتی کرایا جا سکے۔

دس روز تک چنے والا نہیں آیا۔ مجھے اتفاق سے کسی مسافر سے پتہ چلا کہ چنے والا زندہ ہے اور ہسپتال میں بھرتی ہے۔ اُس کے گھر کا خرچ کیسے چل رہا ہوگا مجھے اُس بارے بالکل علم نہیں تھا۔ گیارہویں روز چنے والا پھر کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا اور اُس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ ہاتھ میں پلاسٹر چڑھا ہوا تھا جس میں وہ چنے کی جھبیا پھنسائے ہوئے تھا۔ میں نے اُس سے چنا خریدا اور اُسے اپنے پاس بیٹھا لیا۔ ''ابھی تم پوری طرح سے ٹھیک نہیں ہو۔ کچھ دن اور آرام کرو۔'' میں نے اُسے ہمدردانہ مشورہ دیا۔ وہ مسکرایا تھا جسے دیکھ کر میں لرز گیا۔ کس قدر درد سمایا ہوا تھا اس مسکراہٹ میں۔ اُس نے بتایا کہ گھر کا سارا کباڑ فروخت ہو گیا۔ آج آخری ٹوٹی ہوئی چارپائی بیچ کر اُس نے چنے خریدے ہیں۔ ''وہ کون لوگ تھے جنھوں نے تم کو مارا تھا۔'' اُس نے بتایا کہ ایک تو اُسی کے گاؤں کا ہے اور اسی ٹرین سے آتا جاتا ہے۔ بہت سارے روپوں کا چنا اُدھار کھا چکا ہے۔ اُس کو ہم نے چنا دینے سے منع کر دیا تھا۔ دیکھ لیجے اُس نے اُلٹا ہمیں پٹوا دیا۔ چنے والے نے بتایا کہ اُس پر بڑی ذمہ داری ہے۔ اُس کی ایک بہن ہے جس کی اُسے شادی کرنی ہے اور پھر اُس کے بعد وہ اپنا گھر بھی بسائے گا۔ یہ کہتے ہوئے وہ کافی شرما گیا تھا۔ چنے والے کا اسٹیشن آ گیا تھا۔ ''بابو جی چلتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ اُٹھا تھا لیکن پھر ایک دم سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اُسے چکر آ گیا تھا۔ میں نے اُسے پکڑا کر گاڑی سے نیچے اُترنے میں مدد کی۔ میں نے سوچا کہ کل جب چنے والے سے ملاقات ہوگی تو اُسے کچھ روپے دے دوں گا تا کہ وہ اس دوران آرام کرے اور اپنا خرچ چلا سکے۔ میں اُس کو آج پیسے دینے کے لیے تیار تھا لیکن اتفاق سے آج اپنی ہی جیب خالی تھی۔ لیکن میں اگلے دن چنے والا کا انتظار ہی کرتا رہا۔ اُس کے بعد میری ٹریننگ کے تین مہینے پورے ہو گئے اور چنے والا نہیں آیا اور نہ ہی مجھے چنے والے کی کوئی خیر خبر ملی۔ ٹرین میں چنا بکنا نہیں ختم ہوا اور کئی دوسرے چنے بیچنے والے اور آ گئے تھے۔

اِس واقعے کو پانچ سال سے زیادہ ہو گئے ہیں۔ اکثر چنے والے کا خیال مجھے آ جاتا ہے۔ اُس نے چنا بیچنا چھوڑ دیا ہو یا دوسرا کوئی کام کرنے لگا ہو۔ پتہ نہیں وہ اپنی بہن کی شادی کر پایا یا نہیں۔ یا کیا پتہ وہ اب زندہ بھی ہے یا نہیں۔ کہیں اس کا حشر اس کے باپ جیسا نہ ہوا ہو۔ اِس سے زیادہ میں نہیں سوچ پاتا۔ چنے والے کی یاد آج بھی میرے ذہن میں تازہ ہے۔

☆☆☆